ڈاکٹر عبدالرحمن کاکڑ
لیکچرار، شعبہ پشتو، بلوچستان یونیورسٹی، کوئٹہ۔
ڈاکٹر محمد فاروق انجم
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ پاکستانی زبانیں، نمل، اسلام آباد۔

عبدالرحمان بابا اور علامہ محمد اقبال کے مشترک صوفیانہ افکار کا تقابلی جائزہ

Dr. Abdul Rehman Kakar
Lecturer, Department of Pashto, University of Balochistan, Quetta.
Dr. M. Farooq Anjum
Asstt. Prof. Department of Pakistani Langanges, NUML, Islamabad.

Comparative Study of the Akin Sufic Notions Of Abdul Rehman Baba & Allama Muhammad Iqbal

Literary history of Pashto and Urdu had extensively been influenced by two prominent intellectuals and poets; Abdul Rehman Baba and Allama Muhammad Iqbal, respectively. As, Sub-continent remained cradle of civilizations and nourished collective wisdom of the people; the impact of which has also been observed in religious, spiritual and cultural practices. This article focuses on the efforts of the above-mentioned prominent poets regarding true spirit of Sufism in the region. The scholars have applied qualitative / analytical approach of research. The finding of this research article state that the poets strived to portray true spirit of Sufism in their poetries and criticized the thoughts and philosophies intermingled with Sufism.

Key Words: *Pashto, Urdu, Rehman Baba, Allama Muhammad Iqbal, Literature, Sufism.*

برصغیر کے عظیم مسلمان مفکرین اور شعراء، رحمان بابا اور علامہ محمد اقبال مشرقی ادب کے سرخیلوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف اپنے عصر اور خطے کو متاثر کیا ہے بلکہ عالمی شہرت بھی پائی۔ ان کے اعلی پایہ اشعار کو خطے کی عوام میں کسی بھی دوسرے شاعر کے اشعار سے زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔ امروزہ زندگی کے آئینہ دار، ان مفکرین کے اشعار، ضرب الامثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے ان کی شاعری سے مستفید ہوتے ہیں ۔ کیونکہ ان کی شاعری محض ادبی ذوق پورا کرنے کا کام نہیں کرتی

بلکہ اس میں انفرادی اور مجموعی خودی کو بیدار کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔یہی وجہ ہے کہ انفرادی اثرات کے علاوہ ان کی شاعری نے عوامی تحریکوں کو جنم دیا ہے، خصوصاً علامہ محمد اقبال کی شاعری نے برصغیر کے مسلمانوں کی تحریک آزادی کی صحیح سمت میں رہنمائی کرنے کے علاوہ، کامیابی سے ہمکنار کیا۔

رحمان بابا اور علامہ محمد اقبال کے تصورات کا جائزہ لیا جائے تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انہوں نے مشرقی اور مغربی افکار کو موضوع سخن بنایا ہے ۔رحمان بابا کی شاعری میں مغربی فلسفے اور تصورات کا محض رمق پایا جاتا ہے لیکن علامہ محمد اقبال کی شاعری کا یہ ایک بنیادی موضوع ہے۔علامہ محمد اقبال، رحمان بابا سے صدیوں بعد پیدا ہوئے ہیں، اس لیے جدید مغربی مفکرین کے تصورات سے بھی آشنا تھے؛ باوجود اس کے، کہ ان دونوں کا جھکاؤ مشرقی تصورات کی طرف زیادہ ہے جس میں ایک طرف اسلامی افکار اور دوسری طرف ان کا فطری لگاو بھی کار فرما نظر آتا ہے۔

رحمان بابا اور علامہ محمد اقبال کا تعلق ایک ایسے خطے سے ہے جہاں اسلامی روایات اور افکار بڑے پیمانے پر موجود ہیں۔ انہوں نے ان اسلامی روایات، اسلامی تہذیب و تمدن، ثقافت، سیاست اور ادب کو اپنی لازوال شاعری کے ذریعے دنیا کے علم دوست حلقوں تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔ اسلامی روایات اور افکار کے ساتھ ساتھ انہوں نے مشرقی تہذیب و روایت اور ثقافت کو اپنی شاعری میں نمایاں مقام دے کر امر کر دیا۔

اس مقالے میں ہم نے ان ہمہ جہت مفکرین کی شاعری کے ایک ایسے پہلو کا تقابلی و تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے جس کی اہمیت ہر دور میں مسلم رہی ہے۔ نظریہ میثاق کی رو سے تخلیق کائنات سے پہلے خلیفہ ارض سے خالق کائنات نے اپنے رب ہونے کا جو اقرار لیا تھا، وہ روحانیات کی پہلی کڑی تصور کی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ مختلف ادیان سے ہوتے ہوئے، دین اسلام تک پہنچ جاتا ہے۔ نبوت کے مبارک منصب سے جناب محمد ﷺ کو ایسے وقت اور مقام پر سرفراز کیا، جہاں آپ ﷺ دنیا و مافیہا سے دور عبادت میں کئی دنوں تک مسلسل مشغول ہوتے۔ جس کو تصوف یا روحانیت اسلام کی پہلی کرنیں کہہ سکتے ہیں۔ حیات نبوی ﷺ اور دور خلافت میں زہد اور تزکیہ نفس کی بے شمار مثالیں تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ رحمان بابا اور علامہ محمد اقبال کی شاعری میں بھی تصوفی افکار پر متعدد اشعار ملتے ہیں جن کا تنقیدی و تقابلی جائزہ لیا جائے گا۔

تہذیبی روایات اور اقدار کی امین یہ خطہ نور اسلام سے عہد خلافت میں منور ہوا ہے ۔رحمان بابا کے عہد میں اسلامی اقدار کی رونق ماند پڑ گئی تھی۔ ہر شعبہ زندگی میں دینی احکام، اصولوں اور روایات کو پس پشت

ڈال کر ارتداد کا دائرہ پھیل رہا تھا۔ رحمان بابا نے نہایت سادہ مگر موثر انداز میں اپنی شاعری کے ذریعے ان خرافات کو ختم کرنے کی بھرپور سعی کی۔ اسلاف اور ہم عصر شعراء سے یکسر مختلف انداز میں معاشرے میں موجود خامیوں کو ہدف تنقید بنا کر خطباء، علماء اور دانشوروں کی ایک بڑی جماعت کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ کلمہ حق کی صدا بلند کرنے اور شاعری میں حقیقی اسلامی روح کو اجاگر کرنے کی وجہ سے ان کو بڑے پیمانے پر عوامی مقبولیت حاصل ہوئی جو عصر حاضر میں بھی برقرار ہے۔ بقول رحمان بابا خود ان کی شاعری قرآن و حدیث سے ماخوذ ہے۔ جس کا اظہار یوں کیا ہے:

"دا چې زه و تاته وايمه که خدای ګو

په آيات او په حديث کښې به څرګند وي"(۱)

ترجمہ: یہ جو میں آپ سے کہتا ہوں، انشاءاللہ قرآن اور حدیث کے مطابق ہو گا۔

اسی طرح علامہ محمد اقبال بھی یہی درس دیتے ہے کہ دینی معاملات میں قرآن اور حدیث کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔ تصوف اور اقبال کا نظام فکر کے مصنفین اس بارے میں رقمطراز ہیں:

> "اقبال کے افکار و تصورات کا پہلا سرچشمہ قران کریم ہے۔ کیونکہ اس نور کے بغیر زندگی تاریک ہے، زندگی کا ہر عمل بیکار ہے، کیونکہ یہ شرع محمدی ﷺ کا باطن ہے اور زندگی کا ضمیر ہے۔ اور اقبال اس حقیقت سے اچھی طرح آشنا ہو چکے تھے اور اوروں کو بھی اس سے آشنا کرانے کے لیے اپنی تحریر و اپنے افکار کے ذریعے اس کی تلقین کی کہ:
>
> قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلماں
> اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار
> گر تو خواہی مسلماں زیستن
> نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن
>
> اقبال کے تمام افکار کا سرچشمہ قرآن و حدیث ہیں" (۲)

انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے اوائل میں اس خطے میں مسلمانوں کی اکثریت والے علاقوں میں مغربی تہذیب، تمدن، ثقافت اور مذہبی اقدار کے علاوہ ہنود کا تہذیبی، مذہبی، اور سیاسی غلبہ بھی جاری

تھا۔ برصغیر میں آباد اور سیاسی طور پر مفلوج و مفتوح مسلمانوں کی تہذیبی، اسلامی اور روحانی نظام ہائے فکر کو شدید خطرات لاحق تھے ۔ علامہ محمد اقبال نے مسلمانوں کو پستی سے نکالنے اور اسلامی اقدار کو بحال کرنے کے لیے ان کو سب سے پہلے اپنی خودی کو پہچاننے اور منزل کامیابی سے ہمکنار کرنے کی تلقین کی۔

"خودی کا سر نہاں لا الہ الا اللہ خودی ہے تیغ، فساں لا الہ الا اللہ"(۳)

خودی کو علامہ محمد اقبال نے نئے انداز میں پیش کیا اور اس کو مختلف زاویوں سے زیر بحث لا کر نئی اصطلاح کے طور پر پیش کیا گیا۔ خودی ہی وہ بنیادی نکتہ ہے جو انسانی زندگی میں غیر معمولی کردار ادا کر سکتی ہے۔ ان کے خیال میں کامیابی کا دار مدار خودی کے عروج اور زوال پر منحصر ہے۔

علامہ محمد اقبال نے مسلمانوں کی زندگی کے ہر گوشہ زندگی میں خودی کو اپنانے کی تلقین کی ہے بلکہ مسلمان کی بنیادی پہچان قرار دیا ہے ۔ اقبال کی نظر میں خودی ہی مسلمانوں کو زوال سے نکال کر بام عروج پر پہنچا سکتی ہیں۔ خودی کو انفرادی زندگی سے لے کر مجموعی معاشرتی زندگی تک کے لیے کامیابی کا بنیادی اور لازمی جزو قرار دیا ہے۔

> "اقبال کے خیالات و افکار میں تصور خودی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے فکر و فلسفے کے جملہ دھارے اسی سرچشمہ خودی سے پھوٹتے ہیں۔ اسرار خودی میں اقبال نے زوال امت کا ایک سبب معروف و مقبول شاعر حافظ شیرازی کی شاعری کو بھی قرار دیا۔ اسی طرح افلاطون اور نظریہ وحدت الوجود پر بھی سخت تنقید کی۔ اس پر اقبال کے خلاف ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسرار خودی کی تردید میں متعدد مثنویاں لکھی گئیں۔ اقبال نے اپنے موقف کی وضاحت کے لیے کئی مضامین لکھے۔۔۔۔ اسرار خودی میں فرد کی خودی، انفرادیت اور تشخص پر اتنا زور دیا گیا تھا کہ بعض لوگوں کو ملت کا وجود گم ہوتا نظر آیا۔ اقبال نے وضاحت کی کہ بے خودی دراصل خودی ہی کا ایک پہلو ہے اور بے خودی، خودی کی تکمیل و توسیع کا باعث بنتی ہے۔ "(۴)

اس کو روحانی فلسفہ زندگی سے بھی موسوم کر سکتے ہیں لیکن ایسا فلسفہ حیات روحانی جو ایک سالک کی زندگی کے شبانہ روز کے اعمال کا احاطہ کر سکے۔ جس میں سالک یا ایک مسلمان کی زندگی کے ہر گوشے کا احاطہ کیا گیا ہو۔ اقبال خودی کو مسلمانوں کی زندگی کا ایک جز لاینفک سمجھتا ہے۔ اس لیے حقیقی اسلامی تصوف میں ان تمام مثبت

عناصر کا ہونا ضروری ہے جو سالک کی دنیوی اور اخروی زندگی میں کامیابی کا سبب بنے اور ان تمام منفی عناصر کا قلع قمع کرنا بھی ضروری ہے جس کی وجہ سے سالک روحانیت کی زندگی پر برے اثرات مرتب ہوتے ہوں۔

علامہ محمد اقبال اور ان کے کلام کے شارحین کے افکار کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ خودی تصوف کا ایک ضروری عنصر ہے۔ خودی ہی تصوف کو روحانیات عالم سے ممتاز کرنے کا بنیادی عنصر ہے۔ کیونکہ روحانیات عالم کی بنیاد رہبانیت پر ہے اور تصوف اسلامی رہبانیت سے بے زار اسلامی روحانیت کا نام ہے۔ اقبال ؒ کہتے ہیں:

"یہ ذکر نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں"(۵)

ضرب کلیم میں تصوف کے دوسرے بنیادی اصطلاحات اور موضوعات کے علاوہ خودی کے بارے میں یوں فرماتے ہیں:

"سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی
پسند روح و بدن کی ہے وانمود اس کو
کہ ہے نہایت مومن خودی کی عریانی
وجود سیر فی کائنات ہے اس کا
اسے خبر ہے، یہ باقی ہے اور وہ پانی
---یہ فقر مرد مسلماں نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولت سلمانی و سلیمانی"(۶)

علامہ کے خیال میں رہبانیت اصل میں عیسائی روحانیت کی پیداوار ہے، جس کی اجازت دین اسلام میں نہیں ہے۔ تصوف کے پیروکار ہمیشہ جستجو میں لگا رہتا ہے ۔ وہ راحت پسند نہیں ہوتا بلکہ تکالیف کا مقابلہ خندہ پیشانی سے کرتا ہے۔ اپنی فکر و بساط کے مطابق کوششیں کرتا رہتا ہے۔ وہ پوری کائنات کو اپنی تصرف میں رکھنے کے لیے تگ و دو میں رہتا ہے اور اس کو کامیابی بھی ملی ہے۔ لیکن جب سے مرد مسلمان نے سعی کرنا چھوڑ دیا ہے، اس وقت سے دنیا و مافیہا کی حکمرانی سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔

"رمز و ایما اس زمانے کے لیے موزوں نہیں

اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن
"قم باذن اللہ" کہہ سکتے تھے جو، رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گور کن!"(۷)

اسی طرح خودی کے تمام عناصر رحمان بابا کی شاعری میں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ لیکن رحمن بابا نے اصطلاح خودی کو اقبال کی طرح شاعری کا ایک مرکزی نقطہ قرار نہیں دیا۔ اور نہ ہی رحمان بابا کے ہم عصر کلاسیک شعراء نے خودی کو مخصوص رنگ میں پیش کیا ہے۔ رحمان بابا کہتے ہیں:

"بې منته جام د زهرو ښځلی ښه دی
نه هغه چې منت بار شي و کوثر ته"(۸)

ترجمہ: جام بے منت نوش کرلینا گر زہر کا بھی ہو بہتر ہے جام منت سے ،خواحوض کوثر کی طرح بیش قیمت ہو۔

رحمان بابا کی شاعری میں انفرادی خودی کو ابھارنے اور اس کو ترقی دینے کے لیے کئی اشعار موجود ہیں۔ ایک مذہبی معاشرے میں مذہبی اور روحانی پیشواؤں کے لبادے میں ذاتی فوائد کے حصول کے لیے بے شمار ایسی مثالیں ملتی ہیں جو اپنے پیروکاروں کی خودی کو مٹانے کی علی الاعلان درس دیتے ہیں۔ اس سے معاشرے میں شخصیت پرستی کو زبردست پروان چڑھنے کی روایت چل پڑی ہے جو عصر حاضر میں بھی تحریر، تقریر اور عملی میدان میں بکثرت نظر آتا ہے۔ رحمن بابا نے کئی سو سال پہلے اس مرض سے بچنے کی تلقین کی ہے۔

خودی کو فنا ہونے کی بجائے برقرار رہنے کی جو تلقین کی گئی ہے، بنیادی طور پر یہ احساس ترقی کا ضامن ہے اور اس کے برعکس رہبانیت جو ایک تصوفی اصطلاح ہے جو موجب تباہی ہے۔ اس لیے رحمان بابا کی شاعری میں ہمیں رہبانیت سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ رحمان بابا کی شاعری میں ہر جگہ یہی افکار نظر آتے ہیں جو علامہ کی شاعری کی بنیادی تعلیمات میں سے ہیں۔

"ولایت دی خدای هغه لره ورکړی چې یې ورک کړ سکونت په دا دنیا"(۹)

ترجمہ: ولایت عطا کی اللہ نے ان کو، جنہوں نے سکونت دنیا کو خیرباد کہا۔

اقبال نے تصوفی اصطلاح فنا کو بھی قبول نہیں کیا ہے۔ انہوں نے فنا کو خودی پر غلط اثرات مرتب کرنے اور انسان کی روحانی نشو و نما کی ترقی میں رکاوٹ قرار دیا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا یوں رقمطراز ہے:

> "اقبال کے لیے تصوف کے رہبانیت اور دنیابیزاری کے مسلک کو قبول کرنا بہت مشکل تھا۔ دوسرے، اقبال نے تصوف کے تصور فنا کو بھی قبول نہ کیا جس کے مطابق جزو خود کو کل میں اس طور ضم کر دیتا ہے کہ اس کا اپنا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ اس کے مقابلے میں اقبال نے "خودی" کی نشو نما کو انسان کے روحانی ارتقا کے لیے ناگزیر قرار دیتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ عارفانہ تجربے کے دوران میں "جزو" کل سے ہم رشتہ ہونے کے باوصف اپنے وجود سے دشت کش نہیں ہوتا بلکہ اپنی خودی کو برقرار رکھتا ہے۔ گویا ایک طرف تو اقبال نے زندگی اور اس کے مظاہر کو حقیقی سمجھتے ہوئے ایک مثبت رویے کا مظاہرہ کیا اور دوسری طرف متناہی انا (Finite Ego) کے وجود کا جواز مہیا کر دیا۔"[۱۰]

خودی کی اہمیت اور اس کے راستے میں مختلف رکاوٹوں کی نشاندہی کے بعد اقبال کے ایک ایسے فکری زاویے کو زیر بحث لائیں گے جس میں وہ فلسفہ اور مذہب کے بین راستے کو اپنانے کا حامی ہے۔ فلسفہ اور اس سے جڑے مباحث بنیادی طور پر عقل، دانش اور مشاہدے کو اصول قرار دیتے ہیں۔ عقلی دلائل سے حقائق کی تہہ تک پہنچنا ان کا بنیادی اصول ہے۔ اس کے برعکس مذہب اور روحانیات میں عقل کے مقابلے میں حقائق کے ادراک میں وجدان کو ترجیح دی جاتی ہے۔

چونکہ مذہب کی بنیاد اور اصول آسمانی کتابوں میں درج اصولوں پر رکھا گیا ہے اور مذکورہ احکام مذہب کے پیروکاروں کے لیے حرف آخر ہے۔ اس طرح روحانیات کی جڑیں بھی مذاہب میں پیوست ہیں، لیکن مذہب کے مقابلے میں روحانیات کا وجدان پر بہت زیادہ انحصار ہے۔

اقبال عقل اور وجدان دونوں سے مستفید ہونے اور ان میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے حق میں ہیں۔ اس سلسلے میں معروف محقق ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں:

> "حقیقت عظمیٰ کو جاننے کے لیے آج تک دو اہم راستے اختیار کیے گئے ہیں. ان میں سے ایک راستہ تو عقل اور منطق سے روشن ہے، دوسرا وجدان اور مذہبی سوچ سے

منور ہے. مگر مذہبی سوچ کے سلسلے میں بھی دو روپ نظر آتے ہیں. ایک تو اندھے وشواس کا رویہ ہے جو دل سے مانتا ہے دلیل سے نہیں، جب کہ دوسرے رویے کے مطابق جاننے اور محسوس کرنے کا عمل وجدانی اور وہبی ہے، لیکن اس عمل سے جو راز منکشف ہوتے ہیں انہیں عقل اور اس کے حربے یعنی زبان اور منطق ہی گرفت میں لینے پر قادر ہیں۔ بلکہ اصل بات شاید یہ ہے کہ عقل زمین ہموار کرتی ہے اور سالک کو بتدریج ارتکاز کے اس مرکزی نقطہ پر لے جاتی ہے جہاں وہ عقل کے طریق کار کو چھوڑ کر عشق کے طریق کار کو اپنا لیتا ہے۔ صورت کوئی بھی ہو مذہب کا یہ پہلو عقل اور عشق میں ایک ہم آہنگی سی ضرور پیدا کرتا ہے۔ اقبال مذہب کے اسی رویے کے موید ہیں۔ چنانچہ جہاں وہ ان مفکرین کو ہدف تنقید بناتے ہیں جنہوں نے محض عقل کی مدد سے حقیقت کو پالینے کی کوشش کی، وہاں وہ ان لوگوں کو بھی ناپسند کرتے ہیں جو اس دنیا اور اس کی حقیقتوں کی نفی کرکے رہبانیت کو حرز جاں بنالینے پر سدا مستعد دکھائی دیتے ہیں۔ تصوف کے سلسلے میں بھی اقبال کا رویہ یہ ہے کہ وجدان اور فکر گویا ہم آہنگ ہو جاتے ہیں انہیں پسند ہے۔"(۱۱)

ڈاکٹر اقبال نہ مغربی دانش سے مطمئین نظر آتے ہیں اور نہ ہی مشرقی فلسفہ سے۔ ان کے خیال میں دانشوران اور حکماء مغرب و مشرق نے اپنے اپنے بت تراشے ہیں، جن کا طواف کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے:

"دانش مغربیاں، فلسفہ مشرقیاں　　　　ہمہ بتخانہ و در طوف بتاں چیزے نیست!" (۱۲)

تصوفی ادب میں عشق ایک مشہور افاقی اصطلاح ہے جس کو ہر شاعر نے اپنے مزاج کے مطابق شاعری میں استعمال کیا ہے۔ اسی طرح رحمان بابا اور علامہ محمد اقبال کی شاعری میں اس اصطلاح کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔ رحمان بابا کہتے ہیں:

"دغه واړه کرامات د عاشقی دي
چې څوک قطب کا څوک غوث کا څوک اوتاد" (۱۳)

ترجمہ: کرامات کا یہ ظہور بسبب عاشقی ہے، کسی کو قطب، کسی کو غوث اور کسی کو اوتاد بنا دیتا ہے۔

رحمان بابا کی نظر میں روحانی دنیا میں کمال بلندی پر پہنچنے کے لیے عشق کا دامن تھامنا ضروری ہے۔ اپنی شاعری میں عشق کی توضیح کی ہے اور عشق کی ابتدا و انتہاء کو موضوع سخن بنایا ہے۔یہاں تک کہ ان کی نظر میں کائنات کا سبب بھی عشق ہے۔ اس لیے عشق کو پدر ممکنات گردانتے ہیں۔

"دا جهان دی خدای له عشقه پیدا کړی　　د جمله و مخلوقاتو پلار دی دا"(۱۴)

ترجمہ: اس جہان کی تخلیق کا سبب عشق ہی ہے جو تمام مخلوقات کا باپ ہے۔

معرکہ کائنات میں عشق کے عمل دخل اور عشق کی کرامات کے بارے میں علامہ یوں رقمطراز ہے:

"عشق کی گرمی سے ہے معرکہ کائنات
علم مقام صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب!" (۱۵)

رحمان بابا کی نظر میں عشق کی ماہیت اور اس کے حصول کے لیے مذہب کا سہارا نہیں لیا جا سکتا، کیونکہ عشق کا مذہب سے تعلق نہیں ہے۔ عشق کسبی نہیں وہبی عطیہ ہے۔

"عشق څه هسي علم نه دی
چي حاصل شي له مکتبه
مکتب حال د مذهب وایي
عشق سبوا دی له مذهبه
د عاشق مذهب هم دا دی
چي دم نه وي بې مطلبه"(۱۶)

ترجمہ: عشق ایسا علم نہیں جو مکتب سے حاصل ہو سکے۔ مذہب کو درس گاہ سے جب کہ عشق کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ عاشق کا ہر نفس اسی کی یاد میں گذرتا ہے۔

علامہ کی نظر میں عشق اور علم کا موازنہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"شرع محبت میں ہے عشرت منزل حرام
شورش طوفان حلال، لذت ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام

علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے ام الکتاب!" (۱۷)

تصوف کا ایک بنیادی موضوع اخلاقیات ہے جو تمام مذاہب اور ادیان کا مشترکہ میراث ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ ادیان عالم کو شہرت اور قبولیت اخلاقیات کی بنیاد پر نصیب ہوئی ہے تو بے جانہ ہوگا۔ اسلام چونکہ تمام ادیان سماوی کا خلاصہ ہے اس لیے اس میں اخلاقیات پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اخلاقیات کو دین عیسوی میں بھی نمایاں مقام حاصل ہے لیکن دین محمدی ﷺ میں اس کی توصیف بزبان قرآن بیان کی گئی ہے۔ قران کریم میں انحضرت ﷺ کے بارے میں ارشاد حق تعالی ہے کہ آپ ﷺ کو اخلاق کے اعلی درجے پر فائز کیا گیا ہے۔ اس لیے عہد عتیق سے لے کر آج تک شعرا عرب و عجم میں اخلاقیات کو اولیت دی گئی ہے۔ مشرقی زبانوں کے کلاسیک شعراء نے اخلاق نبوی ﷺ کو اپنی شاعری میں بڑے پیمانے پر استعمال کیا ہے۔ رحمان بابا کی شاعری بھی بنیادی طور پر اخلاقی شاعری ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جو پیغام دیا ہے، اس کے لیے نہایت ہی اخلاقی پیرایہ اظہار سے کام لیا ہے ۔ رحمان بابا نے تنقید کے لیے بھی شائستہ اور اعلی اخلاق سے مزین الفاظ کو چنا ہے. یہی وجہ سے کہ ان کی شاعری کو پوری دنیامیں قبولیت کا درجہ حاصل ہے. پشتو ادب میں حمزہ شینواری کے حوالے سے ایک بات مشہور ہے کہ رحمان بابا کی شاعری سے اگر تصوفی اشعار کو نکالا جائے تو بقیہ حصہ زکواۃ جتنا نہیں رہے گا. رحمان بابا کے حوالے سے حمزہ بابا کے اس بیان کا مقصد اصل میں ان کی اخلاقی شاعری کے متعلق ہے کیونکہ اخلاقیات تصوف کا ایک بنیادی عنصر ہے۔ رحمن بابا کی شاعری سے اگر ان کی اخلاقی شاعری کو الگ کیا جائے تو بہت کم شاعری رہ جائے گی۔ ان کی اخلاقی شاعری سے کچھ اشعار کو بطور نمونہ درج کرتے ہیں جو اخلاقیات کی بھی نظیر مثالیں ہیں:

"کر د ګلو کړه چې سيمه دې ګلزار شي
اغزي مه کره په پښو کښې به دې خار شي
ته چې بل په غشو ولې هسې پوه شه
چې هم دا غشی به ستا په لور ګوزار شي" (۱۸)

ترجمہ: جس علاقے میں مکین ہو، اس کو حسین بنانے کے لیے پھولوں کی آبیاری کرو، نہ کہ کانٹوں کی۔ کیونکہ کانٹے آپ ہی کے پاؤں پیوست ہوسکتے ہیں۔ دوسروں پر تیر برسانے والے سن لو! اسی تیر کا نشانہ آپ بھی ہوسکتے ہیں

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

"د خليل تر کعبې دا کعبه ده لويه که ودان کا څوک ويران حرم د زړه" (۱۹)

ترجمہ: کعبہ خلیل سے ہے یہ کعبہ بڑا، اگر کسی کی ویران اور دکھی دل کو کوئی آباد کرے۔

”که تن ځمکه کړې زړه تخم باران اوښکي　　لکه نخل سر به وکاږې له خاکه“[۲۰]

ترجمہ: اگر وجود کو زمین، دل کو بیج اور آنسوؤں کو اس کی بارش بنالیں، بعید نہیں کہ نخل کی طرح نکل آؤگے خاک سے۔

قلب سے قلب سلیم تک کا سفر کرنے کے لیے اس پر ریاضت اور مشقت کرنا پڑتا ہے۔ صوفیانہ ادب میں قلب ایک جوہر نورانی ہے اور اس کو عرش الٰہی بھی کہا جاتا ہے۔ اور اس کو ویران کرنا، کعبہ خلیل کو ویران کرنے سے بڑا گناہ تصور کرتا ہے۔ تصوفی ادب میں جس اخلاقی فلسفے کے لیے سالہاسال ریاضت کرنا پڑتی ہے، اس پر کتابیں لکھی گئی ہیں، اس کو رحمان بابا نے انتہائی سادہ زبان میں بیان کیا ہے۔

بانگ درا میں عقل و دل کے عنوان سے ایک منظوم مکالمہ ہے، جس کے آخری شعر میں دل یوں گویا ہے:

”کس بلندی پہ ہے مقام مرا　　عرش رب جلیل کا ہوں میں!“[۲۱]

دل کو صوفیانہ ادب میں مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے رحمن بابا اور علامہ محمد اقبال کی شاعری میں بھی دل یا قلب کو اہمیت دی گئی ہے۔

”ہمچو تن پابند آئین است دل　　مردہ از کیں زندہ از دین است دل!“ [۲۲]

ترجمہ: جسم کی طرح دل بھی آئین کا پابند ہے۔ بغض اور حسد سے دل مر جاتا ہے اور دین سے دل زندہ ہوتا ہے۔

”اقبال اور معاصرین کا فلسفہ اخلاق“ کے مصنف ڈاکٹر اصغر علی بلوچ علامہ محمد اقبال کی اخلاقیات پر مبنی شاعری کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ”اقبال کا نظام اخلاق اسلامی ہونے کے ساتھ ساتھ عالم گیر بھی ہے، کیونکہ ان کے نزدیک وہی اقدار و روایات اعلیٰ اخلاقی زندگی کی نمائندہ ہیں جو دنیا کے دیگر بڑے مذاہب میں بھی عزت و آبرو کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ وظیفہ فن کا تقاضا ہے کہ نظریات کا جمالیاتی حسن اور عالمگیریت برقرار رکھی جائے کیونکہ تجربے کو احساس، فکر کو جذبہ اور شعور کو اسلوب بنا دینے کا نام ہی شاعری ہے۔۔۔ اقبال کے ہاں مذکورہ بالا تمام موضوعات کی رنگارنگی پائی جاتی ہے لیکن ان کا اخلاقی پہلو اتنا نمایاں ہے کہ اس کو تمام فکری مواد کا مرکز ماننا پڑتا ہے۔ اخلاقی فضائل کی متعدد اقسام ہیں جن میں ایجابی

اور سلبی اقدار شامل ہیں۔ ایجابی اقدار میں عزت نفس، خودداری، آزادی، حق گوئی، عزم و استقلال، جدوجہد، بہادری، غیرت وحمیت وغیرہ اور سلبی اقدار میں زہد، توکل، قناعت، تواضع، عاجزی، خاکساری، عفو، درگذر، حلم اور بردباری وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح ایجابی انفرادی اقدار اور ایجابی اجتماعی، سلبی انفرادی اور سلبی اجتماعی اقدار کی تقسیم بھی کی جاسکتی ہے۔"(۲۳)

"ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوع انسان کو اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا"(۲۴)

مختصر یہ کہ عبدالرحمن بابا اور علامہ محمد اقبال کی شاعری میں بنیادی اصول قرآن اور حدیث ہیں۔ دونوں معتبر شعراء نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ان کی شاعری کا مرکز و محور بنیادی اسلامی ماخذات یعنی قرآن اور حدیث مبارکہ ہیں۔ اس بنیاد پر ان کی شاعری میں مشترک تصوفی افکار کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ دونوں کی شاعری پر تصوف کے گہرے اثرات ہیں۔ علامہ محمد اقبال ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ ہیں جن کا تصوف سے پرانا رشتہ ہے جب پوری دنیا میں صوفی شاعر کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

اسلامی علوم سے واقفیت اور لگاؤ کی وجہ سے ان دونوں شعراء کی شاعری میں مذہبی رجحان اور مذہب کی طرف جھکاؤ زیادہ ہے۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری میں مذہبی اور روحانی مباحث بدرجہ اتم موجود ہیں۔ انہوں نے اندھی تقلید کی بجائے ان پیروں پر زبردست تنقید بھی کی ہے جو تصوف کے لبادے میں عوام کو گمراہ کر رہے ہیں۔ جعلی پیروں اور ان کے مشرکانہ اور ملحدانہ افکار کو بھی طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا ہے اور اپنی شاعری کے ذریعے عوام کو ان سے بچنے اور صحیح اسلامی عقاید جن کا حکم قرآن کریم اور احادیث مبارکہ سے ثابت ہو، کو اپنانے کی تعلیم دی ہے۔ جعلی پیروں اور روحانیت کے دعویداروں کو ہدف تنقید بنانے پر تصوف مخالف اور تصوف سے بیزار ہونے کا الزام بھی لگا ہے؛ خصوصاً علامہ محمد اقبال پر ان کے ناقدین نے ذاتی عناد کی بنیاد پر تصوف مخالف ہونے کا الزام لگایا ہے۔

تصوف اور اس کے پیروکاروں کے لیے ان کی شاعری میں یہ پیغام موجود ہے کہ مرید یا سالک ان عادات و اطوار کو خیرباد کہے جو اس کی مذہبی، روحانی اور سماجی زندگی کو زک پہنچائے۔ خودی کو ہر حالت میں بحال و برقرار رکھنے کی ہر ممکن سعی کی جائے ۔ علامہ محمد اقبال تصوف کے تصور فنا سے بھی اختلاف رکھتے ہیں اور تصوراتی تصور پر فنا ہونے کے عمل کو بھی ناروا سمجھتے ہیں ۔

پوری کائنات میں انسان کو اشرف المخلوقات اور خلیفۃ الارض کا مقام دینے سے بھاری ذمہ عائد ہوتی ہے ۔ دنیاوی مصائب کو جھیلنے، ان کے حل کیلئے تگ و دو کرنے، سماجی زندگی بہتر بنانے، احکام الٰہی پر عمل کرنے کیلئے خودی کا برقرار ہونا لازمی ہے۔ انہوں نے جعلی ملا، پیر، فقیر، قلندر اور مرشد پر اس لیے اپنے تنقید کا نشانہ بنایا ہے کہ وہ ملائیت، پیری اور فقیری کے لباس میں اندھی تلقید کرنے والے جاہل عوام کا استحصال کرتے ہیں۔

علامہ کی شاعری میں اندھی تقلیدی روایت پر بھی تنقید کی گئی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں اور علمائے شریعت اسلام پر زور دیا ہے کہ وہ پرانی روایات جو مسلمانوں کے زوال کا سبب بنے ہیں، میں جدت پیدا کریں؛ تاکہ عصر حاضر کے مسلمان نہ صرف غلامی کی زندگی سے آزاد ہو جائیں بلکہ زمام اقتدار سنبھالنے کے قابل ہو جائیں اور اس طرح پوری دنیا اسلام کے نور سے منور ہو گی۔ مروجہ طریق تصوف میں بھی روایت اور اندھی تقلید زوروں پر ہے جو رحمان بابا اور علامہ کی نظر میں سم قاتل ہے، اس لیے فقہ اور تصوف سے ان کا خاتمہ اور ان کو اصلی صورت میں بحال کرنا لازمی ہے۔

مختصر یہ کہ رحمن بابا اور علامہ اقبال کی شاعری میں صوفیانہ افکار کے حوالے سے مشترک عقائد، افکار و نظریات پائے جاتے جن پر عمل کرنے سے امت مسلمہ اور انسانی زندگی میں مثبت انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ رحمن بابا، دیوان، مرتب، میاں سید رسول رسا، یونیورسٹی بک ایجنسی، پیشور، خیبر پشتونخوا، ص ۲۴۳

۲۔ منیر، ڈاکٹر شبنم، ڈاکٹر صابرہ شبنم صدیقی، تصوف اور اقبال کا نظام فکر، آر-آر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۲۰، ص ۲۸۶

۳ محمد اقبال، ڈاکٹر علامہ، ضرب کلیم، مرتب، عبداللہ اکیڈمی الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور، ص ۱۵

۴۔ اقبال، علامہ محمد، محسن زبان و ادب اردو، مرتب، پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۷، ص ۸۵-۸۶

۵۔ محمد اقبال، ڈاکٹر علامہ، ضرب کلیم، ص ۳۴

۶۔ ایضاً، ص ۵۰-۵۱

۷۔ محمد اقبال، ڈاکٹر علامہ، بال جبریل، اسد نیئر پرنٹرز، لاہور، عبداللہ اکیڈمی اردو بازار لاہور، ۲۰۰۹، ص ۱۵۹

۸۔ عبدالرحمن، دیوان، منظوم اردو ترجمہ، امیر حمزہ شنواری، پشتو اکیڈمی، یونیورسٹی آف پشاور، جولائی ۱۹۶۳، ص ۱۲۹

۹۔رحمان بابا، دیوان، مرتب، حنیف خلیل، دانش خپرندویه تولنه، ۲۰۰۵، مخ ۹۷

۱۰۔ آغا، ڈاکٹر وزیر، تصورات عشق وخرد اقبال کی نظر میں، اقبال اکادمی پاکستان، طبع ششم ۲۰۱۰، ص ۸۴

۱۱۔ آغا، ڈاکٹر وزیر، تصورات عشق وخرد اقبال کی نظر میں، ص ۶۲-۶۳

۱۲۔اقبال، علامہ محمد، شرح جاید نامہ، ترجمہ و تشریح، پروفیسر مفتی محمد وسیم اکرم قادری، عبداللہ اکیڈمی الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور، ۲۰۱۸، ص ۱۱۷

۱۳۔رحمان بابا، دیوان، سریزه، حبیب الله رفیع، صدیقي خپرندویه تولنه کوټه، ۲۰۱۰، ص ۱۸۴

۱۴۔رحمان بابا، دیوان، مرتب،حنیف خلیل، مخ ۵۶

۱۵۔اقبال، علامہ ڈاکٹر، ضرب کلیم، ص ۲۱

۱۶۔رحمان بابا، دیوان، سریزه، حبیب الله رفیع، مخ ۳۱۴

۱۷۔اقبال، علامہ ڈاکٹر، ضرب کلیم، ص ۲۱

۱۸۔رحمان بابا، دیوان، مرتب او سریزه ، حبیب الله رفیع، ص ۴۶۳

۱۹۔رحمان بابا، دیوان، مرتب، خلیل، حنیف، مخ ۳۲۲

۲۰۔رحمان بابا، دیوان، مرتب او سریزه ، حبیب الله رفیع، ص ۳۶۶

۲۱۔اقبال، علامہ محمد، بال جبریل، ترجمہ و تشریح، یوسف مثالی، ص ۶۳

۲۲۔اقبال، ڈاکٹر علامہ، کلیات اقبال اردو (بانگ درا)، ادارہ وسال اشاعت ندارد، ص ۴۹۴

۲۳بلوچ، ڈاکٹر اصغر علی، اقبال اور معاصرین کا فلسفہ اخلاق، مثال کتاب گھر، امین پور بازار، فیصل آباد، ۲۰۱۷، ص ۲۶

۲۴۔اختر، ڈاکٹر سلیم، فکر اقبال کا تعارف، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲، ص ۴۵